© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فکر و نظر

اسلام اور جمہوریت میں تصورِ اہلیت

آج پانچ برس گزرنے کے بعد پاکستانی قوم ایک بار پھر انتخابات کے اہم ترین قومی مرحلے کا سامنا کررہی ہے۔ پاکستان کی تاریخ کے یہ انتخاب جہاں ایک طرف انتہائی متنازعہ حیثیت کے حامل ہیں، شکوک وشبہات اور وسوسوں، اندیشوں کے مہیب سائے پھیلے ہوئے ہیں وہاں اس کے نتائج بھی نوشتہ دیوار کی طرح ثبت ہیں۔ اس کے باوجود خواہی نخواہی ہر آنے والا دن انتخابات کی طرف ہمارے قدم بڑھا رہا ہے۔ ان انتخابات کے لئے سیاسی رہنماؤں کی سرکردگی میں قوم نے کئی سالوں سے مطالبے اور ہڑتالیں کی ہیں اور سیاسی لیڈر قوم کو یہ تاثر دینے میں پوری طرح کامیاب نظر آتے ہیں کہ وہ ہر آنے والی نئی حکومت سے اپنی شمعِ اُمید وابستہ کرلے۔ لیکن کتنے ہی مراحلِ انتخاب سے، جو سیاسی جماعتوں کے لئے وصالِ محبوب کی سی حیثیت رکھتے ہیں، گزرنے کے باوجود آج بھی پاکستانی قوم نہ صرف بدامنی، بدحالی، بے انصافی اور بے روزگاری جیسے بنیادی مسائل سے بری طرح دوچار ہے بلکہ دنیا کی کرپٹ ترین، غیر منظّم، انتہا پسند، باہم منقسم اور غیر محفوظ قوم ہونے کے 'اعزازات' بھی پاچکی ہے۔

آمریت کے زیر سایہ ۸ برسوں کے دوران ہمارے ہاں جمہوریت کا صور اس شدت سے پھونکا گیا ہے کہ پاکستان کے شہری اب حقیقی جمہوریت کو بھی حسین خواب تصور کرتے ہیں۔ ہر قومی لیڈر جمہوریت کے نام کی یوں مالا جپتا نظر آتا ہے گویا یہ کوئی جنتِ گم گشتہ اور پاکستانی قوم کے دکھوں کا حقیقی درماں ہو۔ یوں تو ان حالات میں جمہوریت کے تقاضے پورے ہونا بھی ناممکن نظر آتا ہے لیکن بالفرض اگر جمہوریت کو اس کی حقیقی روح کے ساتھ پانے کی ہم 'سعادت' حاصل کر بھی لیں تو کیا اس سے ہمارے ملکی و ملی مسائل میں کمی واقع ہونے کا کوئی امکان موجود ہے؟ یہی سوال زیر نظر تحریر کا موضوع ہے کہ سیاسی میدان میں ہماری وہ کونسی ایسی

© rasailojaraid.co

لغزشیں ہیں جن کی بنا پر اسلامی ریاست بنانے اور اسلامی معاشرہ قائم کرنے کا خواب ابھی تک شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔

آمریت اور جبر واستبداد کو تو جدید دنیا کا اجتماعی ضمیر اب ردّ کر چکا ہے، اور میدانِ سیاست میں اسے جاہلیت کی ایک مذموم روایت سے زیادہ کوئی حیثیت حاصل نہیں رہی، اور فی الوقت جمہوریت کو ایک بہترین اور مثالی طرزِ حکومت باور کیا جاتا ہے لیکن ہماری نظر میں جمہوریت یا 'سلطانئ جمہور' سے صبح نو کی اُمید وابستہ کرلینا بھی ایک سراب سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان دنوں پاکستان کے مرکزی شہروں میں جمہوریت کے نام پر جو سیاسی نقشہ اور مستقبل کا منظر نامہ دکھائی دیتا ہے، وہ بھی ایک دردمند اور محبّ ِدین وملت فرد کو مزید رنج والم اور پریشانیوں کا شکار کردینے کے لئے کافی ہے۔

الحمدللہ پاکستان کے اکثریتی باشندے مسلمان ہیں اور قرآن وسنت ہی ہمارا سرمایۂ حیات ہے۔ قرآن وسنت پر ایمان اور اس کو زیر مطالعہ رکھنے والا مسلمان جس سیاسی ڈھانچے اور اجتماعی نظام سے مانوس ہوتا ہے، اس کی جانب کوئی سنجیدہ پیش قدمی دور دور تک پاکستان کے اسلامی معاشرے میں ناپید نظر آتی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ اسلام تو درکنار تحریکِ پاکستان کے نامور قائدین کے فرمودات کو بھی پوری قوم پسِ پشت ڈال چکی ہے۔ مقامِ افسوس ہے کہ مسلمان ایک بہترین سیاسی نظام کے حامل ہوتے ہوئے بھی اَغیار سے فکری بھیک مانگنے کا رویہ اپنانے پر قانع ہوئے بیٹھے ہیں۔

ہمارے موجودہ سیاسی منظرنامے میں ہم کن پہلوؤں سے کوتاہی کا شکار ہیں، اس کی نشاندہی کرنا اہل فکر ونظر کا فرض ہے، تاکہ حق کا پیغام اور اللہ کی حجت پوری ہوتی رہے۔ جہاں تک عملی کوتاہی کا تعلق ہے تو اسے مجبوری اور اضطرار تک ہی محدود رہنا چاہئے۔ لیکن جب یہ عملی کوتاہی اعتقاد ونظریے کی شکل اختیار کرجائے تو پھر قوموں کی واپسی انتہائی مشکل ہوجایا کرتی ہے۔ ان حالات میں کتاب وسنت سے منور شدہ نظام کو ہی ہمیں پیش نظر رکھنا ہوگا اور یہی ایک مسلمان کا سرمایۂ حیات ہے!

اسلام اور جمہوریت میں کئی پہلوؤں سے اساسی اور جوہری فرق پایا جاتا ہے۔ چونکہ آج

© rasailojaraid.com

کل ہمیں انتخاب کا مرحلہ درپیش ہے، اس لحاظ سے ہم یہاں اسی مناسبت سے چند بنیادی پہلوؤں کا تقابلی جائزہ پیش کریں گے:

اسلام کا تصورِ اہلیت اور مقصدِ حکومت

اسلام کا سیاسی نظریہ دراصل اللہ کی حاکمیتِ اعلیٰ کا مظہر اتم ہے۔ اللہ کی یہ حاکمیتِ مطلقہ ہمارے دستور کی طرح محض ایک لفظی عیاشی نہیں بلکہ ایک بڑی زمینی حقیقت کی حامل ہے جس سے اسلام کے نظامِ سیاست اور دیگر نظام ہائے سیاست میں بنیادی نوعیت کے فرق واقع ہوجاتے ہیں۔ اللہ کی حاکمیت جس پر قرآن وسنت کی بے شمار آیات واحادیث شاہدِ عدل☆ ہیں، اسلام کے سیاسی ڈھانچے کی ایک بالکل جداگانہ صورت گری پر منتج ہوتی ہے۔

اس کے باوجود ہمارے ہاں بعض لوگوں کے نزدیک اللہ کی حاکمیت یا اقتدارِ اعلیٰ کا محض لفظی اقرار کرلینا اور اسے سرفہرست درج کرلینا ہی کافی ہے جیسا کہ ہمارے قانون دانوں یا اقتدار پر فائز طبقوں کا رویہ ہے۔ یا بعض دانشور اللہ کی اس حاکمیت کے نظریے کو بحیثیت ِمجموعی 'انسانوں کی خلافت' قرار دیتے ہوئے اُنہیں یہ حاکمیت منتقل کرکے اس مرکزی تصور سے گریز کی راہیں تلاش کرتے رہے ہیں جبکہ مذکورہ بالا دونوں طریقوں سے اسلام کے سیاسی نظریہ کی حقیقی روح مجروح ہوکر رہ جاتی ہے۔

اللہ کی حاکمیت سے مراد ایک طرف اللہ کی شریعت کی حاکمیتِ مطلقہ ہے، تو دوسری طرف اس کا مدعا اس شریعت کے نفاذ کے لئے ایسے افراد کا مناصبِ حکومت پر سرفراز ہونا ہے جو اللہ کی حاکمیت اور شریعت کو نہ صرف اپنی ذات پر، بلکہ تمام انسانوں پر نافذ کرنے کی کامل واتم صلاحیت سے بہرہ ور ہوں۔ اس سلسلے میں قرآنِ کریم کی زیر نظر آیت اساسی حیثیت رکھتی ہے جس سے علامہ ابن تیمیہؒ نے سیاستِ شرعیہ کے دو بنیادی اُصولوں کا استنباط کیا ہے، اور یہی اُصو لدراصل اسلام کے نظامِ سیاست کا اصل الاصول اور بنیادی جوہر ہیں:

☆ان آیات واحادیث کے مطالعے کے لئے دیکھئے **'اسلامی سیاست'** از مولانا گوہر رحمٰن: ص ۲۲۰ تا ۲۶۷ اور جمہوری تصورِ حاکمیت کے لئے: **'اسلام کا طرزِ حکومت'**: محدث، جون ۲۰۰۰ء، ص ۴۸ تا ۵۵ جبکہ دونوں کے تقابلی مطالعہ کے لئے: **خلافت وجمہوریت** از مولانا عبدالرحمٰن کیلانی: ص ۲۲۵ تا ۲۳۰

www.KitaboSunnat.com

© rasailojaraid.com

﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأۡمُرُكُمۡ أَنۡ تُؤَدُّوا الۡأَمَانٰتِ إِلىٰٓ أَهۡلِهَا وَإِذَا حَكَمۡتُمۡ بَيۡنَ النَّاسِ أَنۡ تَحۡكُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ﴾ (النساء:۵۸)

''اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس امر کا پابند کیا ہے کہ وہ اجتماعی ذمہ داریوں کو ان کے اہل افراد کو ادا کریں اور لوگوں میں انصاف کا مرحلہ درپیش ہو تو شریعتِ اسلامیہ سے ہی فیصلہ کریں۔''

یہ آیت اسلام کے نظامِ سیاسی کا مرکز ومحور ہے جس میں کئی بنیادی تصورات کی نشاندہی کی گئی ہے، مثلاً

① اللہ تعالیٰ نے مناصب یعنی ذمہ داریاں اہل افراد کے سپرد کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور اہل افراد کو ذمہ داری تفویض (ادا) کرنا ایک فرض ہے، نہ کہ حق۔ اس فرض کے مخاطب ومکلّف متعدد مفسر صحابہؓ وتابعینؒ☆ کے نزدیک عوام الناس کی بجائے مسلمانوں کے اہل حل وعقد یا ذمہ دار لوگ (مسلمانوں کے اولیا واُمرا) ہیں۔

② یہ آیت اجتماعی ذمہ داریوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس کو 'امانت' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، گویا یہ اختیار اور منصب اللہ کی طرف سے ایک 'امانت' ہے جس کی ادائیگی میں کوتاہی خیانت کے مترادف ہے۔

③ اس آیت میں مندرج اہلیت سے مراد ایسے افراد کو مناصب پر فائز کرنا ہے جو اللہ کے قانون کو اللہ کی سرزمین پر بہتر طور پر نافذ کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوں تاکہ معاشرے میں اللہ کے قانون کی عملداری ہو۔

آیت کے مذکورہ بالا مفاہیم پر قرآن وسنت کی کئی آیات واحادیث واضح دلیل ہیں، مثلاً

❶ کسی اہل فرد کو تعین کرنا ایک حق نہیں بلکہ ایک فرض اور بار ہے جس کو بہ احسن طور انجام دینا انتہائی ضروری ہے۔ چنانچہ جو شخص اس ذمہ داری کو صحیح طور پر انجام نہیں دیتا، اس کے بارے میں زبانِ نبویؐ سے شدید وعید آئی ہے:

قال رسول الله ﷺ: «إذا ضُيِّعَتِ الأمانة فانتظر الساعة» قال: كيف

☆ حضرت علیؓ بن ابی طالب، ابن عباسؓ، زیدؒ بن اسلم، شہرؒ بن حوشب اور مکحولؒ نے کہا کہ یہ آیت اُمرا اور حکام کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ تفسیر ابن جریر: ۱۴۵/۵، ابن کثیر ۳۲۱/۲، قرطبی: ۲۵۶/۵...... مزید تفصیل کے لئے دیکھیں: 'محدث' بابت ۱۹۷۹ء کا خاص نمبر 'جمہوریت یا اسلام': ص ۴۵

www.KitaboSunnat.com

© rasailojaraid.com

إضاعتها؟ قال : «إذا وُسِّد الأمر إلى غير أهله فانتظر الساعة »

''نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب امانت ضائع کی جانے لگے تو پھر قیامت کا انتظار کرو۔ صحابہ نے پوچھا: یارسول اللہ! امانت کے ضیاع سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا کہ جب ذمہ داریوں کو نااہل افراد کے سپرد کیا جانے لگے تو پھر قیامت☆ کا انتظار کرو۔'' (صحیح بخاری:۵۹)

اسلام کی رو سے تمام اختیارات کی مالک اللہ جل جلالہ کی ذاتِ باری تعالیٰ ہے یعنی حاکمیتِ الٰہیہ۔ اور دنیا میں جو شخص بھی اس اختیار کو استعمال کرتا ہے، اسے اس اختیار کو اللہ کی ایک امانت سمجھ کر ہی استعمال کرنا چاہئے، اور یہ مناصب بھی من مانی اور حکمرانی چلانے کی بجائے اسی جذبے اور تصور سے اہل افراد کو دیے جانے چاہئیں تاکہ وہ ان کا حق ادا کریں۔

۲ اسلام کی نظر میں یہ منصب اور ذمہ داری ایک اعزاز کی بجائے ایسی ذمہ داری اور امانت ہے جس کا محاسبہ بڑا شدید ہوگا۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

«إنها أمانة وإنها يوم القيامة خزي وندامة، إلا من أخَذَها بحقها وأدّى الذي عليه فيها» (صحیح مسلم:۱۸۲۵)

''یہ منصب ایک ذمہ داری ہے جو روزِ قیامت رسوائی اور ندامت کا موجب ٹھہرے گی۔ ماسوا اس شخص کے جو اس حالت میں اس پر فائز ہوا کہ وہ اس کا حق رکھتا تھا اور اس نے اس ذمہ داری کو ادا کرنے کی پوری کوشش کی۔''

۳ اسلام کا مسلم ذمہ داران سے تقاضا یہ ہے کہ وہ اجتماعی ذمہ داریوں پر ایسے افراد کو فائز کریں بلکہ مسلمانوں کی خدمت اُنہیں پر مامور کریں جو اس کی بہتر اہلیت رکھتے ہوں۔

اہلیت کی دو صورتیں ہیں: اہلیت بالفعل یا اہلیت بالقوۃ

یعنی ایسے شخص کا ماضی اس امر کا آئینہ دار ہو کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو نبھاتا ہو اور ماضی میں دی گئی ذمہ داریوں کو ذاتی اختیار و تعیش میں صرف کرنے کی بجائے قومی مصالح اور منصب کے فرائض کو نبھانے پر اپنی توجہ مرکوز رکھتا ہو۔

اس سلسلے میں مذکورہ بالا آیت کا شانِ نزول مزید رہنمائی کرتا ہے۔ یہ آیت فتح مکہ کے

☆ اس فرمانِ نبویؐ میں قیامت کے انتظار سے مراد یا تو اجتماعی ہلاکت و بربادی ہے، یا انفرادی موت یا عذاب جیسا کہ امام راغب اصفہانیؒ نے المفردات میں الساعة کے یہی تین معانی بیان کئے ہیں۔ (۵۱۳/۱ مترجم)

www.KitaboSunnat.com

© rasailojaraid.com

موقع پر اس وقت نازل ہوئی جب آپ ﷺ بیت اللہ میں داخل ہوئے اور آپ نے بیت اللہ کی چابیاں بنو شیبہ سے لے کر حضرت عباسؓ کو دینے کا قصد کیا تو اللہ تعالیٰ کو یہ اَمر ناگوار گزرا اور اللہ نے روکتے ہوئے یہ حکم نازل فرمایا کہ عثمانؓ بن طلحہ کا خاندان چونکہ پہلے بیت اللہ کا کنجی بردار تھا، اور اُنہوں نے اپنی ذمہ داری بہ طریق احسن انجام دی تھی، اس لئے اب بھی یہ ذمہ داری اُنہی کو تفویض کی جانی چاہیے۔ (تفسیر ابن کثیر: زیر آیت محولہ بالا)

چنانچہ بیت اللہ کی چابیوں کی ذمہ داری کے لئے حضرت عثمانؓ بن طلحہ کے خاندان کو منتخب کرنے کی بنیاد ان کی ماضی کی وہ ثابت شدہ اہلیت تھی جو مستقبل میں بھی اس امر کی قوی ضمانت ہے کہ وہ آئندہ بھی اس منصب کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہوں گے۔

بعض اوقات ایسے تو نہیں ہوتا کہ ماضی میں کسی شخص نے کوئی کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہوں لیکن اس متعلقہ فرد میں یہ اہلیت بالقوۃ موجود ہوتی ہے کہ یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ یہ شخص دیگر اُمور میں اپنی ذمہ دارانہ روش کی بنا پر مزید سونپے جانے والے معاملات میں ذمہ داری کا مظاہرہ کرے گا، لیکن اس نوعیت کی اہلیت کے بارے میں ایک سے زیادہ آرا بھی پائی جاسکتی ہیں، جیسا کہ اُسامہ بن زیدؓ کو غزوات پر امیر بناتے ہوئے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا:

«إن تطعنوا في إمارته فقد كنتم تطعنون في إمارة أبيه من قبل وأيم الله إن كان لخليقا للإمارة وإن كان لَمِن أحب الناس إليَّ وإن هذا لَمِن أحب الناس إلي بعده» (صحیح بخاری: ۴۴۶۹)

''تم اس کی امارت کے بارے میں اعتراض کرتے ہو، اور تم اس سے قبل اس کے والد کے بارے میں بھی یہی رویہ اختیار کر چکے ہو۔ واللہ! یہ امارتِ لشکر کے لئے بالکل موزوں ہے، اس کا والد میرے لئے محبوب ترین تھا اور یہ بھی اس کے بعد میرے لئے محبوب ترین ہے۔''

علامہ ابن تیمیہؒ کسی بھی منصب پر تعیناتی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

''اَصلح (اہل و موزوں ترین) فرد موجود ہے تو ولی الامر کا فرض یہ ہے کہ وہ اُسے ولایت واختیار عطا کرے، اگر اَصلح موجود نہ ہو تو پھر صالح کو یہ ذمہ داری تفویض کرنی چاہیے۔ ہر منصب اور عہدے کے مناسب حال الامثل فالامثل کو مقرر کرنا والی کا فرض ہے۔ اگر والی نے اپنی طرف سے پوری کوشش اور جدوجہد کے بعد ایسا کر دیا تو اس نے ولایت وخلافت کا حق ادا کر دیا اور

© rasailojaraid.com

کہا جاسکتا ہے کہ ایسا حکمران عادل اور عند اللہ 'مقسط' ہے۔'' (سیاستِ شرعیہ: ص ۹۶)

پھر منصب کی دو بنیادی اہلیتوں کا ذکر کرتے ہوئے امام صاحب فرماتے ہیں:

''صاحبِ منصب کے لئے قوی اور امین ہونا بنیادی اوصاف ہیں۔ اور قوت سے مقصود علم وعدل اور اپنے احکام کو نافذ کرنے کی اہلیت ہے جبکہ امانت سے مراد خشیتِ الٰہی اور حقوقِ الٰہی کو قلیل متاعِ دنیا کے عوض فروخت نہ کردینا ہے۔'' (ایضاً: ص ۹۷)

چنانچہ اسلام میں منصب پر تعین اہلیت کی بنا پر ہی ہوتا ہے، نہ کہ کسی اور بنا پر اور جو شخص یہ ذمہ داری ایسے فرد کو تفویض کرے جو اس کا اہل نہیں ہے تو ایسے شخص کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے بڑے سخت الفاظ میں وعید نازل فرمائی ہے:

«من وُلِّي من أمر المسلمين شيئًا فولّى رجلاً وهو يجد من هو أصلح للمسلمين فقد خان الله ورسوله» (مستدرک حاکم، فتاویٰ ابن تیمیہ: ۳۶۹/۶)

''جس شخص کو مسلمانوں کے معاملات میں کوئی ذمہ داری سونپی گئی اور اس نے کسی شخص کو آگے منصب پر فائز کیا، حالانکہ اس منصب کے لئے اس سے بہتر شخص موجود تھا تو آگے منصب پر فائز کرنے والا یہ شخص اللہ اور رسولؐ (کی امانت) میں خیانت کا مرتکب ہے۔''

ایک اور فرمانِ نبویؐ ان الفاظ سے بھی آیا ہے کہ

«من استعمل رجلاً من عصابة وهو يجد في تلك العصابة أرضٰى منه فقد خان الله وخان رسوله وخان المؤمنين» (مستدرک حاکم: ۹۲/۴)

''جس نے ایک جماعت پر ایسے شخص کو ذمہ داری سونپی حالانکہ اس جماعت میں اس سے زیادہ موزوں اور بہتر شخص موجود تھا تو اس نے اللہ، اس کے رسول اور مسلمانوں سے خیانت کا ارتکاب کیا۔''

۲ مسلمانوں میں کسی کو ذمہ داری دینے کا مقصد صرف حکومت اور شریعتِ الٰہیہ کا قیام ہونا چاہئے نہ کہ کوئی اور دوسری منفعت۔ قرآنِ کریم کی اس آیت کے دوسرے جز ﴿أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ﴾ سے حاصل ہونے والا یہ دوسرا بنیادی اُصول ہے۔

یوں تو اس آیت کا بکثرت حوالہ دیا جاتا ہے لیکن ہمارے ہاں عدل کا مفہوم مطلق اور وسیع معنی میں لیا جاتا ہے جب کہ اسلام میں عدل کے مفہوم کا تعین نبی کریم ﷺ کے اس فرمانِ

مبارک سے بخوبی ہوجاتا ہے جسے حضرت علیؓ نے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ فرماتے ہیں:

«كتاب الله فيه نبأ ما كان قبلكم وخبر ما بعدكم وحكم ما بينكم هو الفصل ليس بالهزل . من قال به صَدَق ومن عمل به أُجر ومن حَكَم به عدل»

''یہ اللہ کی کتاب (قرآنِ مجید) ہے جس میں گذشتہ قوموں کے حالات ہیں اور آنے والے واقعات کی خبر ہے۔ یہ کتاب تمہارے مابین پیش آنے والے مسائل کے لئے فیصلہ کن (حَکَم) ہے۔ یہ فیصلہ کرنے والی کتاب ہے، کوئی مذاق نہیں۔ جس نے اس کی بنا پر کوئی بات کی تو اس نے سچ بولا۔ جس نے اس کی بنا پر عمل کیا تو وہ اجر کا مستحق ہوگیا، اور جس نے اس کے مطابق فیصلہ کیا تو اُسی نے عدلِ حقیقی کو ملحوظ رکھا۔'' (سنن ترمذی:۲۹۰۶)

◉ اس فرمانِ نبویؐ میں عدل وانصاف کو کتابِ الٰہی کے ساتھ فیصلہ کرنے سے مشروط قرار دیا گیا ہے۔ اسلام کی نظر میں کتابِ الٰہی کو نظر انداز کرکے عدل کرنا ممکن نہیں، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں یہ بھی قرار دیا ہے کہ

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ (المائدۃ:۴۵)

''جو اللہ کی نازل کردہ وحی (قرآن وسنت) سے فیصلہ نہ کریں تو ایسے لوگ ظالم ہیں۔''

ظاہر ہے کہ 'ظلم' عدل کے عین متضاد وصف ہے۔ اور کتاب وسنت کے ماسوا سے فیصلہ کرنے کو 'ظلم' سے تعبیر کیا گیا ہے، گویا اس آیت کا مفہومِ مخالف یہ تقاضا اور تعین کرتا ہے کہ عدل سے مَا أنزل الله کے مطابق فیصلہ کرنا ہی مراد لیا جائے۔ چنانچہ ہر وہ فیصلہ جو کتاب اللہ کو نظر انداز کرکے کیا جاتا ہے، انسان چاہے اس کو لاکھ عدل تصور کرے لیکن درحقیقت اللہ کی نظر میں وہ عدل کا حقیقی تقاضا پورا نہ کرتے ہوئے ظلم کا مرتکب ہوتا ہے۔

کتاب وسنت سے فیصلہ کرنے اور اللہ و رسول ﷺ کو فیصلہ کن حیثیت دینے پر بیسیوں آیات واحادیث پیش کی جاسکتی ہیں، لیکن تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ چنانچہ قرآن میں ذکر کردہ عدل کو قرآن کے تصورِ عدل سے ہی مشروط سمجھنا ضروری ہے۔

◉ اسلام میں حکومت اور مناصب کا مقصدِ اصلی 'شریعتِ اسلامیہ کا نفاذ' ہے، حتیٰ کہ حضرت علیؓ نے ایک بار اپنے دورِ خلافت میں لوگوں کو امارت کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ''امارت کا قیام ہر حال میں ضروری ہے، چاہے امیر ذاتی طور پر نیک ہو یا گناہ گار۔

© rasailojaraid.co

لوگوں نے پوچھا کہ امیرالمومنینؓ! نیک امیر کا تو مقصد واضح ہے، فاجر امیر کا کیا فائدہ؟ تو آپؓ نے جواب دیا کہ اس سے اتنا فائدہ تو ضرور حاصل ہوگا کہ

يُقام بها الحدود وتأمن بها السُّبل ويجاهد به العدوّ ويُقسم بها الفيء

''حدود اللہ کو قائم کیا جائے گا، گزرگاہوں میں امن وامان قائم ہوجائے گا، دشمنِ اسلام سے جہاد ممکن ہوگا اور مالِ فئے کی تقسیم ہوسکے گی۔'' (فتاویٰ ابن تیمیہ:۳۷۹/۶)

◉ حضرت علیؓ کا ایک اور فرمان یہ بھی ہے کہ

''مسلمانوں کے فرمان روا پر یہ فرض ہے کہ وہ اللہ کی نازل کردہ شریعت سے فیصلہ کرے اور امانت ادا کرے اور جب وہ یہ کام کررہا ہوتو مسلمانوں پر بھی یہ فرض ہے کہ وہ اس کی سنیں اور اس کی اطاعت بجالائیں۔'' (کنز العمال)

حضرت علیؓ کے ان فرامین سے پتہ چلتا ہے کہ امارتِ اسلامیہ کے بنیادی فرائض میں حدود اللہ کا قیام، امن وامان، ریاستِ اسلامیہ کا تحفظ اور ظلم وستم کا خاتمہ وغیرہ شامل ہیں اور ظاہر ہے کہ حدود اللہ کا قیام ایک شرعی تصور وضرورت ہے۔قرآنِ کریم میں ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ﴾... الخ

''اگر ہم مسلمانوں کو زمین میں اقتدار بخشیں تو یہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو قائم کریں گے۔''

مصر کے ممتاز مفکر سید قطب شہید لکھتے ہیں کہ

''میں ان لوگوں کو غلط فہمی کا شکار سمجھتا ہوں جو کہتے ہیں کہ اسلامی نظام اصل میں اسلامی سوشلزم ہے، یا اسلامی جمہوریت ہے۔اسلام کے نظام سیاسی کے چار بنیادی اُصول ہیں: حاکمیتِ الٰہ، عدل من الحکام، اطاعت فی المعروف اور شوریٰ۔'' (العدالة الاجتماعية:ص۹۳ تا ۱۰۱)

موجودہ سیاست سے ایک تقابل

یہ تو ہیں شریعتِ اسلامیہ کے واضح اور دوٹوک تصورات جن کی مختصر طور پر یاددہانی کے بعد آیئے ہم دیکھتے ہیں کہ فی زمانہ ہمارے ہاں منصب واعزاز کو کس بنا پر حاصل کیا یا عطا کیا جاتا ہے اور عوام کس بنا پر اپنے نمائندے منتخب کرتے ہیں؟ یہاں یہ واضح رہنا چاہئے کہ جمہوریت اپنی اساس، ساخت اور طریق کار ہر پہلو سے اسلام کے نظامِ سیاست سے یکسر مختلف ہے۔

© rasailojaraid.com

اسلام کے تصورِ انتخاب، تصورِ نمائندگی، تصورِ اہلیت، اساسی جوہر، مقصد ومطلب اور بنیادی تصور ومیکانزم غرض ہر پہلو سے اسلام اور جمہوریت میں واضح تضاد پایا جاتا ہے لیکن سردست دیگر پہلوؤں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہم صرف تصورِ اہلیت تک محدود رہیں گے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کردہ آیات واحادیث سے علم ہوا کہ اسلام کی نظر میں منصب کا تعین اہلیت کی بنا پر ہی ہوتا ہے اور کوئی خارجی بنیاد اس میں مؤثر نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دیگر تمام وجوہات مختلف لوگوں کو مناصب پر فائز تو کرسکتی ہیں لیکن معاشرے اور اجتماع کی خدمت اور ترقی کی قوی ضمانت قرار نہیں پاسکتیں اور شریعتِ مطہرہ کے نفاذ وعمل داری کی طرف بھی معاشرے کا رخ موڑنے پر قادر نہیں ہوتیں۔

لیکن جب ہم اپنے گردوپیش پر نظر دوڑاتے ہیں تو فی زمانہ ہمیں بے شمار ایسے اُمیدوارانِ مناصب میدانِ سیاست میں نووارد نظر آتے ہیں، جن کی مطلوبہ منصب کے لئے اہلیت کسی سابقہ کارگزاری اور اجتماعی خدمت کی بجائے، بعض اوقات کسی مضبوط سیاسی پارٹی کی پشت پناہی ہوتی ہے، تو کوئی اُمیدوار ایک منصب کے دیوانہ وار حصول کے لئے اَن گنت مال ودولت لٹانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کسی کی قوت کا راز اس کے مضبوط خاندانی اثر ورسوخ میں پوشیدہ ہے تو کوئی عوام کو اپنی جادو اثر وعدوں سے متاثر کرکے اُن سے ووٹ مانگنے کی صلاحیت سے مالا مال ہے۔ حتیٰ کہ بعض سیاستدانوں کے ووٹ حاصل کرنے کی اہم بنیاد اس کے سوا کوئی نہیں ہوتی کہ وہ بعد میں اپنے ووٹروں کے جائز وناجائز کام کروانے کے لئے بڑے مؤثر تصور کئے جاتے ہیں۔ بعض سیاستدان صرف اس بنا پر کامیاب ہوجاتے ہیں کہ وہ نفسیاتی ہتھکنڈوں سے بخوبی فائدہ اُٹھانے کا ہنر رکھتے ہیں یا بعض جاگیرداروں کے ووٹر اُن کو منتخب نہ کریں تو وہ امیدوار اُن لوگوں کا جینا دوبھر کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔

یہ اور اس نوعیت کی کئی دیگر وجوہات ہیں جن کی بنا پر عوام کی رائے پراثر انداز ہوکر موجودہ جمہوری نظام میں سیاسی رہنما عوام کے نمائندے بن بیٹھتے ہیں جو دراصل عوام کی ضروریات کے استحصال یا ان کے وقتی جذبات سے فائدہ اُٹھا کر درحقیقت اپنا اُلو سیدھا کرتے ہیں۔

☆ مزید تفصیل کے لئے دیکھیں: 'اسلام اور جمہوریت میں تصورِ نمائندگی': محدث اکتوبر ۱۹۹۲ء، ص ۲ تا ۱۰

www.KitaboSunnat.com

© rasailojaraid.com

جمہوریت کا یہ تصورِ اہلیت و نمائندگی آج دنیا کے بیسیوں ملکوں میں اپنی حقیقت آشکارا کر چکا ہے جس میں بظاہر عوام کا نمائندہ بننے والا درحقیقت محض مقابلتاً چند ووٹوں کی اکثریت کا مرہونِ منت ہوتا ہے اور اکثر وبیشتر اس کو نامنظور کرنے والے مجموعی طور پر اس کو قبول کرنے والوں سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں، گویا ردّ کرنے والوں کی مجموعی اکثریت کے باوجود وہ ان کا نمائندہ ٹھہرتا☆ ہے۔ اس بنا پر بظاہر عوام کی نمائندگی کا اعزاز پانے والے 'عوام کی حکومت' کے نام پر اَشرافیہ کا ایسا نیا جتھا بن بیٹھتے ہیں جو عوام سے ایک بار ووٹ لینے کے بعد اپنے منصب کے باقی ایام عوامی خدمت سے قطع نظر اپنے مفادات کی اسیری اور اپنی لالچ وطمع کی تسکین کے لئے ہر لمحہ صرف کرنے میں گزار دیتے ہیں۔ گویا جمہوریت کا نظریہ 'حکومت ِعوام' اس نعرے اور لفظ کے استحصال سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتا، جس میں اشرافیہ کا ایک گروہ عوام کی حکومت کے نام پر ان کے سر پر مسلط رہتا ہے۔

اس کی مثالیں جدید دنیا میں ہر طرف بکھری نظر آتی ہیں، جیسا کہ آج عوام کی حکومت کے نام پر نہ صرف پاکستان میں ابتدا ہی سے چند خاندان 'عوامی حاکمیت کا مصداق' ٹھہر چکے ہیں بلکہ دنیا کی بڑی جمہوریتوں مثلاً امریکہ وبھارت میں بھی چند خاندانوں (گاندھی، نہرو اور بش وکلنٹن وغیرہ) کے گرد ہی 'عوامی حاکمیت' کا نعرہ طواف کرتا دکھائی دیتا ہے۔ دوسری طرف عوام جمہوریت کے نام سے حکومت کا اِلزام سہنے کے باوجود ابھی تک محروم اور بنیادی سہولتوں کے ہی متلاشی نظر آتے ہیں۔

ہر دو نظاموں میں تصورِ اہلیت کا تجزیہ

◉ اسلام اور جمہوریت میں اہلیت کا یہ فرق دراصل ہر دو نظاموں کی اساسی روح میں

☆ اسلام میں عوام کی رائے بڑی اہمیت رکھتی ہے لیکن اس کا کردار انفعالی ہے، وہ منصب کی نشاندہی کی صلاحیت تو نہیں رکھتے لیکن صاحب ِمنصب ان کا اعتماد یافتہ ضرور ہوتا ہے جسے ولاۃ الامر اہلیت کو مدنظر رکھتے ہوئے متعین کرتے ہیں، جیسا کہ حضرت عثمانؓ کو خلیفہ متعین کرتے ہوئے عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے رائے عامہ کو پیش نظر رکھا تھا: إني قد نظرت في أمر الناس فلم أرهم يعدلون بعثمان (بخاری:۷۲۰۷) خلفاے اربعہ میں سے کسی کا انتخاب جملہ عوام نے براہِ راست نہیں کیا لیکن وہ سب اُمت کے اعتماد یافتہ تھے۔

www.KitaboSunnat.com

© rasailojaraid.com

موجود ہے۔ جمہوریت چونکہ عوامی حاکمیت کا داعی نظامِ سیاست ہے، اس لئے وہاں انتخاب کا یہ اختیار بظاہر عوام کو ہی حاصل ہے۔ جبکہ اسلام چونکہ حاکمیتِ الٰہیہ کا علم بردار ہے، اس بنا پر وہاں اجتماعی مناصب کی اہلیت کے لئے متعلقہ فرد کا شریعتِ اسلامیہ کے نفاذ اور اسلامی تصورات پر عمل داری کے لئے موزوں ومناسب ہونا زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

◉ یہ بھی حاکمیت کے اساسی نظریے کا ہی مظہر ہے کہ اسلام میں حاکمیت چونکہ اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، اس بنا پر اس کی شریعت کے ماہر اور اس پر عمل پیرا لوگ نہ صرف خود ذمہ داریوں کے لئے موزوں ٹھہرتے ہیں بلکہ آگے بھی مناصب کے لئے نامزدگی کرنا ان کا استحقاق ہوتا ہے۔ گویا اسلام میں مناصب کی تقسیم اوپر سے نیچے کی طرف ہوتی ہے، جس میں عوام کا انتخاب میں کوئی کردار ہونے کی بجائے صاحبِ منصب کے لئے محض ان کا اعتماد یافتہ ہونا ہی کافی ہوتا ہے۔☆ اس کے برعکس جمہوریت چونکہ حاکمیتِ عوام کی داعی ہے، اس بنا پر جمہوریت میں عہدوں کی تعیناتی اہل فکر ونظر کی بجائے، ہر شخص کا بنیادی حق قرار پاتی ہے۔ یعنی حکومت بظاہر نیچے سے اوپر کی طرف جاتی دکھائی دیتی ہے۔ ایسی صورت میں معاشرے میں بھی اللہ کی طرف رجوع کی بجائے عوام الناس کے مفادات یا غیر الٰہی اَغراض پورے ہونے کے امکانات قوی ہوتے ہیں جبکہ اسلام کا مقصد معاشرے کو اللہ کی بندگی کی طرف لانا ہے۔

◉ اسلام کا یہی تصورِ حاکمیت اس کے طرزِ شورائیت میں بھی نمایاں ہے۔ اگر مشاورت میں ووٹنگ کا طریقہ اپنایا جائے تو اس کا مطلب تمام اراکین کی حاکمیت کا تحفظ ہے جو وہ عوام سے لے کر آئے ہوتے ہیں۔ اور ووٹنگ کا تقاضا یہ ہے کہ جس طرف یہ حاکمیتیں زیادہ ہوجائیں، فیصلہ اس کے مطابق ہونا چاہئے جبکہ اسلام میں حاکمیتِ الٰہیہ کا تصور ہے، اس بنا پر ووٹنگ کی بجائے دلیل واستدلال کی بنا ہی پر فیصلہ ہوتا ہے، جو شرعی وتجرباتی ہر دو نوعیت کے

☆ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عثمان بن عفان کو اشارتاً ان کی امارت کے متعلق یہ ہدایت فرمائی تھی کہ «يا عثمان! إنه لعل الله يقمصك قميصًا فإن أرادوك على خلعه فلا تخلعه» (سنن ترمذی:۳۷۰۵) ''عثمان! عنقریب اللہ تعالیٰ تجھے خلعت (امارت) پہنائیں گے، لوگ تجھ سے اس کے اُتارنے کا مطالبہ کریں گے، لیکن تو اسے مت اُتارنا۔''

www.KitaboSunnat.com

© rasailojaraid.com

دلائل ہوتے ہیں۔ البتہ ذوقی یا احتمالی دلائل میں صاحبِ امر کو ایک رائے کو ترجیح دینے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ گویا اسلامی شورائیت کئی 'متوازی حاکمیتوں کے اشتراک' کی بجائے اللہ کی حاکمیت کے قریب ترین ہوتی ہے اور اس کے اراکین بھی ماہر شریعت ہوتے ہیں، جیسا کہ خیرالقرون کی شوریٰ کے اراکین کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

◉ اسلام میں رائے عامہ کسی منصب کے لئے فیصلہ کن کردار ادا نہیں کرتی بلکہ ارکانِ شوریٰ یا ولاۃ الامر مختلف ذمہ داریوں کے لئے اَفراد کو متعین کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام کا انتخاب تو ان کے ذاتی مقاصد یا ظاہری نعروں کے تابع ہوتا ہے جس کے دھوکے میں وہ آجاتے ہیں۔ جبکہ اسلام کا بنیادی مقصد معاشرے پر اللہ کی حاکمیت یعنی شریعتِ اسلامیہ کا نفاذ ہے، اس لئے وہاں ایسے ہی لوگ الٰہی مقاصد کی تکمیل کی غرض سے مختلف لوگوں کی اہلیت کے مطابق ان کو ذمہ داریاں سونپتے ہیں۔

◉ علاوہ ازیں جمہوریت میں چونکہ مناصب بظاہر تمام عوام کا استحقاق ہیں، اس بنا پر ہر منصب کے لئے ایک مخصوص وقت مقرر ہے، تاکہ بعد میں یہ منصب دوسرے لوگوں کو بھی حاصل ہوسکے۔ جبکہ اسلام کی رو سے منصب کا اصل رخ اللہ کے دین کو بدرجہ اتم نافذ کرنے کی ذمہ داری کو پورا کرنے اور فلاحِ عامہ کی اہلیت سے متعلق ہے، اور جو شخص اس مقصدِ شرعی کو پورا کرنے کی اہلیت سے بہرہ ور ہو، وہ ایک طویل عرصہ اس منصب پر متمکن☆ رہ سکتا ہے، تاوقتیکہ وہ اس میں کسی خلل (کفر بواح وغیرہ) کا مرتکب نہ ہو اور یہ مدت انتہائی کم یا انتہائی زیادہ بھی ہوسکتی ہے۔ چنانچہ اسلام میں جمہوریت کی طرح عوام کسی امیر کی معزولی کا فیصلہ کرنے کے مجاز نہیں ہوتے، البتہ جب حکمران نماز کے بنیادی فرض سے غفلت شعاری اپنائے تو اس وقت لوگوں پر اس کی اطاعت کرنا ضروری نہیں رہتا۔

ممکن ہے کہ بعض لوگ یہ کہیں کہ اسلام کا نظامِ سیاست یعنی 'خلافت' حاکمیتِ الٰہی کے نام پر ایک مخصوص مذہبی طبقے کی حکومت کا نام ہے، جس کو تھیا کریسی کے نام سے جدید دنیا بڑی شدت سے ردّ کرچکی ہے۔ اس سلسلے میں واضح رہنا چاہئے کہ اسلام میں نہ تو علما کا کوئی مخصوص

☆ تفصیل کے لئے دیکھئے: مقالہ 'نفاذِ دین کے لئے چند شرائط' مقالاتِ اصلاحی: ج ۱ ص ۲۵۳ تا ۲۵۸

© rasailojaraid.com

طبقہ ہے، نہ ہی پاپائیت کی طرح اُنہیں عام شخص سے کوئی امتیاز حاصل ہے اور نہ اس کے لئے کوئی خصوصی احکامات ہیں۔ البتہ اسلام ایک خاص طبقہ کی بجائے ایک مخصوص علمی اہلیت☆ اور ایک عملی کیفیت (تقویٰ) کا تقاضا ضرور کرتا ہے جو اللہ کی شریعت کو سمجھنے، پھر اسے اپنے اور دوسروں پر نافذ کرنے کے لئے ضروری ہے۔ غرض خلافت درحقیقت اللہ کی حاکمیت (شریعت کی حاکمیت) کا نام ہے، جس شریعت کی خلیفہ بھی مخالفت کرے تو وہ مستوجبِ سزا ٹھہرتا ہے۔ دیکھئے حضرت ابوبکرؓ صدیق کا خطبہ خلافت

الغرض اسلام کا نظریۂ اہلیت، اس کے تصورِ اقتدارِ اعلیٰ سے جڑا ہوا ہے۔ اللہ کی ذات حاکم اعلیٰ ہے تو اس کی شریعت کو اُس کے الفاظ ومراد کی بنا پر دنیا میں نافذ کرنا اسلام کا مقصدِ اصلی ہے۔ اور جو لوگ اس شریعت پر عمل پیرا اور اس کے حامل ہیں، وہ لوگ معاشرے میں مزید ذمہ داروں کو متعین کرکے معاشرے کا رخ اسلامی مقاصد کی طرف موڑنے کے ذمہ دار ہیں۔

'اسلامی جمہوریت' کیونکر؟

جمہوریت جہاں ایک طرف عوام کی حاکمیت کی دعویدار ہے، وہاں اس بنیادی نعرے کے بعد اس کا دوسرا بنیادی اُصول اللہ کی حاکمیت کا انکار یعنی سیکولرزم (مذہب بیزاری) بھی ہے۔ گویا ایک طرف جمہوریت عوام کی حاکمیت کی داعی ہے تو اس کے ساتھ ہی مذہب کی حاکمیت یا عمل داری کی شدید مخالف بھی ہے۔ اور اپنے اس موقف میں بڑی واضح ہے لیکن ہمارے ہاں بعض دانشوروں کا نظریۂ خلافت عجب ثنویت کا شکار ہے۔ ایک طرف تو وہ اللہ کے لئے اقتدارِ اعلیٰ کا تصور رکھتے ہیں تو ساتھ ہی وہ یہ اقتدارِ اعلیٰ انسان کو بحیثیتِ مجموعی منتقل کردیتے ہیں کہ

> ''عام مسلمان خلیفہ ہوتے ہیں اور پھر وہ اپنی خلافت ایک شخص میں مرکوز کرتے اور اسے تفویض کرتے ہیں۔''

ایسے لوگوں کا یہ رویہ اسلام کے نام پر دراصل جمہوری تصورات کی عمل داری کا ہے جس کو اسلام کا مجموعی مزاج کسی طرح قبول نہیں کرتا اور کتاب وسنت میں اس کے خلاف کئی ایک دلائل موجود ہیں۔ ایسی اسلامی جمہوریت اور مغربی جمہوریت میں صرف اتنا فرق ہے کہ وہاں یہ حاکمیت تمام انسانوں کو حاصل ہوتی ہے اور یہاں تمام مسلمانوں کو۔

© rasailojaraid.com

یاد رہے کہ اللہ کی حاکمیتِ مطلقہ میں انسان تو کجا، سید المرسلین ﷺ بھی شریک نہیں۔ قرآن کی رو سے کسی نبی کو روا نہیں کہ وہ لوگوں کو اللہ کی بجائے اپنی طرف دعوت دے بلکہ نبی کی بات کو بہ تسلیم ورضا قبول کرنے کی وجہ بھی اس بات کے من جانب اللہ ہونے میں پوشیدہ ہے، کیونکہ نبی کا تعین اللہ کی طرف سے ہوتا ہے، اور وہ اللہ کی وحی کو ہی اپنی زبان سے ادا کرتا ہے، اس لئے اُس کی ہر بات کو تسلیم کیا جاتا ہے۔

تصورِ حاکمیت کی اس ثنویت کے ساتھ یہ اَمر مزید حیرانگی کا باعث ہے کہ جب بعض متحرک دینی جماعتیں ایک طرف تو سیکولرزم کے اَثرات سے ملک کو بچانے کے لئے غیر معمولی جدوجہد کرتی نظر آتی ہیں تو دوسری طرف اس جمہوری طرزِ سیاست کی بھی علم بردار نظر آتی ہیں جس کا دوسرا اساسی اُصول 'سیکولرزم' ہے۔

جمہوریت کو اسلامی بنانے اور کہنے کا تصور ایک سراب سے زیادہ نہیں کیونکہ ہر نظام اپنی وضع قطع اور ساخت و پرداخت میں اپنے اساسی نظریات ومعتقدات کا یقینی مظہر ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ جمہوریت کا تصورِ اہلیت اور اسلام کا تصورِ اہلیت دو بالکل متضاد تصور ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان دونوں کے لئے ہر دو نظاموں میں بالکل جداگانہ میکانزم اختیار کیا گیا ہے۔ غیر اسلامی نظاموں کو اسلامی لیبل لگا دینے سے کوئی نظام ہرگز اسلامی نہیں بن سکتا!!

◉ اسلام کی رو سے اجتماعی میدان میں مقاصدِ شرع کی تکمیل ایسا برتر مقصد ہے جو اگر فاجر سلطان سے بھی پورا ہوتا ہو تو ایسے امیر کو اس دوسرے حکمران پر ترجیح دی جائے گی جو ذاتی طور پر تو نیک و پرہیز گار ہے، لیکن مقاصدِ شرع کی تکمیل کی صلاحیتِ تامہ سے محروم ہے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ سے جب ایسے دو اشخاص کی بابت یہ پوچھا گیا کہ کس کو ترجیح دی جائے؟ تو اُنہوں نے یہ دانش مندانہ موقف پیش کیا کہ

> ''اجتماعی مصالح کی بہتر تکمیل کے لئے ایسے فاجر امیر کا انتخاب زیادہ موزوں ہے، بجائے ایسے متقی شخص کے جو اجتماعی مصالح کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ فاجر کا فجور اس کی ذات کے لئے ، جبکہ اس کا عامۃ المسلمین کے لئے مفید ہونا عوام کے لئے نفع بخش ہے۔ برخلاف ایسے شخص کہ جو ذاتی طور پر تو متقی ہے، لیکن عوام میں دین وشریعت کے نفاذ اور دیگر مقاصد کو پورا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہے۔'' **مُلخّصًا**

© rasailojaraid.com

◉ اسلام میں چونکہ حاکمیت عوام کا حق نہیں ہے، بلکہ اللہ وحدہ لاشریک کا حق ہے، اس بنا پر یہاں جمہوریت کے عین برعکس یہ تصور بھی موجود ہے کہ خلافت کے لئے طریقۂ انتخاب زیادہ اہم ہونے کی بجائے خلیفہ کا حاکمیتِ الٰہیہ کے مقاصد سے ہم آہنگ ہونا زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ دوسری طرف جمہوریت میں سلطانئ جمہور کے نام پر اساسی حیثیت طریقۂ انتخاب کو ہی حاصل ہے، اس کے بعد عملاً حکومت کے پورے پانچ برس 'عوام کی حاکمیت' کے نظریے کا تمسخر ہی اُڑایا جاتا ہے۔ جمہوریت کا نظریہ حاکمیت عوام کا اظہار محض مرحلۂ انتخاب کے وقت ہوتا ہے جبکہ اسلام میں حاکمیتِ الٰہ کا اظہار دورانِ حکومت لگا تار ہوتا رہتا ہے۔

اسلام میں منصب کے لئے مروّجہ مناسبتوں کی نفی

اسلام کی رو سے کسی منصب کے لئے معتبر اہلیت صرف وہی ہے جس کا شریعتِ مطہرہ نے اعتبار کیا ہے۔ جہاں تک جمہوری نظام کی متعارف کردہ مختلف اہلیتوں کا تعلق ہے تو اسلام نے بڑی شدت سے ان اہلیتوں کو ناقابل قبول قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں ذاتی منفعت کے لئے منصب کی اُمیدواری اصلاً حرام ہے، کیونکہ اس میں اُمیدوار کے پیش نظر ذاتی مفاد ہوتا ہے، جیسا کہ مختلف احادیثِ نبویہؐ میں یہ مضمون بیان ہوا ہے کہ

إن قومًا دخلوا عليه سألوه ولايةً فقال: «إنا لا نولِّي أمرنا هذا مَن طلبه»

''بعض افراد نے نبی ﷺ سے مناصب کا تقاضا کیا تو آپ نے فرمایا کہ ہم مسلمان ان لوگوں کو اپنی ذمہ داریاں نہیں سونپتے جو ان کے طلب گار ہوں۔'' (صحیح مسلم: ۳۴۰۲ وغیرہ)

اس نوعیت کے متعدد فرامین نبویؐ کو ملحوظ رکھتے ہوئے بآسانی یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی فرد کا ایک منصب کی خواہش کرنا ہی اس کی نا اہلی کی دلیل ہے کیونکہ شریعت نے صراحت کے ساتھ اس اُمیدواری اور طلبِ جاہ سے منع کردیا ہے۔ یہ طلب گاری اور خواہش مندی محض کوئی ظاہری مطالبہ نہیں بلکہ ایک فرد کی ذاتی وارداتِ قلبی ہے جس کے دوررَس نتائج اس فرمانِ نبویؐ میں بیان ہوئے ہیں، جو آپ نے ایک صحابی (ابوذرّ غفاریؓ) کو مخاطب کرتا ہوئے فرمایا تھا:

«لاتسئل الإمارة فإنك إن أعطيتَها من غير مسئلة أُعنتَ عليها وإن أعطيتَها عن مسئلة وُكِّلتَ إليها» (صحیح بخاری:۶۷۲۲)

© rasailojaraid.com

''امارت کا مطالبہ نہ کرو۔ اگر تمہیں یہ منصب بلاخواہش کے مل جائے تو تمہاری اللہ کی طرف سے مدد کی جائے گی، اور اگر تم اپنی خواہش سے منصب پر فائز ہوتے ہو تو اس کے نتائج کی تمامتر ذمہ داری تم پر ڈال دی جاتی ہے۔''

ایسے ہی آج کے دور میں ذاتی قرابت داری یا ذاتی پسند و ناپسند اور مفادات کی بنا پر اکثر و بیشتر مناصب کو تقسیم کیا جاتا ہے، جبکہ اسلام کی نظر میں موزوں ترین اہلیت کو نظر انداز کر کے ایسا کرنا صریحاً ناجائز ہے، جیسا کہ حضرت عمرؓ کا فرمان ہے کہ

من وُلِّيَ من أمر المسلمين شيئًا فولّى رجلا لِمَودة أو قرابة بينهما فقد خان الله ورسوله والمسلمين (فتاویٰ:۲۶۹/۶)

''جسے مسلمانوں کے اجتماعی معاملہ کا اختیار ملا اور اس نے دوسرے شخص کو ذاتی محبت یا قرابت داری کی بنا پر یہ ذمہ داری سونپ دی تو ایسا شخص اللہ اور رسولؐ سے خیانت کا سزاوار ہے۔''

علامہ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

''پس اگر والی جادۂ استقامت سے ہٹ گیا، یا زیادہ حق دار اور اَصلح کو چھوڑ کر کسی قرابت، وَلاء وعتاقہ، دوستی یا کسی آبادی میں اپنائیت اور موافقت کی بنا پر، یا مسلکی موافقت یا کسی اور وجہ کی بنا پر، یا باہم ایک جنس ہونے مثلاً ایرانی، ترکی، رومی ہونے کی وجہ سے یا رشوت یا کسی دوسری منفعت کی وجہ سے، یا کسی بھی دیگر ایسے اسباب کی بنا پر...... یا حق دار سے ذاتی کینہ وعداوت کی بنا پر، اس نے حق دار و مستحق اَصلح شخص کو چھوڑ کر غیر مستحق، غیر اصلح کو منصب پر مقرر کیا تو وہ یقیناً اللہ، اس کے رسول اور عام مسلمانوں سے خیانت کا مرتکب ہوا، جس سے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کی اس آیت میں واضح طور پر منع کیا ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ (الانفال:۲۷)

''مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول سے خیانت کا ارتکاب ہرگز نہ کرو اور نہ ہی اپنی امانتوں میں خیانت کرو، تم اس کے وبال سے خوب واقف ہو۔'' (سیاستِ شرعیہ مترجم: ص ۸۸)

الغرض اسلام کا تصورِ اہلیت ایسا قابل عمل نظام ہے جس میں شریعتِ اسلامیہ کے نفاذ اور اجتماع کے برتر مفاد پورے ہونے کے امکان زیادہ قوی ہوتے ہیں اور یہ جمہوریت کے تصورِ اہلیت کے عین برعکس ہے جو صرف عوام کے ذاتی مفادات کے گرد گھومتا ہے۔ اور اہل دین

© rasailojaraid.com

کومنتخب نہ کرنے کی بنیادی وجہ یہی ہوتی ہے کہ اگر یہ لوگ اقتدار میں آ گئے تو سہولتوں اور منفعتوں کی بجائے ہمیں بھی شریعت کی پابندی کرائیں گے۔ اور انسان سہولت پسندی کے باعث کسی بھی پابندی سے گھبراتا ہے، اس لئے اہل دین کی بجائے اپنا ووٹ بھی ان لوگوں کو دینے کو ترجیح دیتا ہے جس کا حوالہ دے کر بعد میں اپنا کوئی کام نکالا جا سکے۔

اسلام کا تصورِ انتخاب

اسلامی معاشرہ ایک ذمہ دار معاشرہ ہے جس میں اسلام کی تعلیمات کو اگر اپنی روح کے ساتھ روبہ عمل لایا جائے تو مسلمانوں میں باہمی خیر وصلاح اور محبت ومودّت کے ساتھ خدمت وقربانی کرنے والے کئی افراد از خود نمایاں ہو جاتے ہیں، جیسا کہ دورِ نبویؐ میں ایسے ہی ہوا تھا لیکن ایسے قیمتی افراد کے انتخاب کی اہلیت سے عوام الناس باخبر ہونے کی صلاحیت سے بہرہ ور نہیں ہوتے بلکہ عوام الناس کی نظر الٰہی مقاصد کی بجائے اپنے ذاتی مفادات کی اسیر یا انہی کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔

چنانچہ ایسے اہل حل وعقد یا اصحابِ شوریٰ کسی انتخاب یا اُمیدواری یا سیاسی مہم جوئی کے نتیجے میں منتخب نہیں ہوتے جیسا کہ خیر القرون اس قسم کے شور وشغب سے بالکل خالی نظر آتے ہیں بلکہ ان کا واحد طرۂ امتیاز ان کا عمل اور ماضی کا خدمت سے بھرپور شاندار ریکارڈ ہوتا ہے۔ ان کا ماضی ہی ان کے موزوں انتخاب کی اہلیت ٹھہرتا ہے، جو مستقبل میں ان کے متوقع ذمہ دارانہ کردار کی ضمانت ہوتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو مسلمانوں کے امیر کے لئے آنکھ اور کان کا کردار ادا کرتے ہیں۔ پھر مسلمانوں کا امیر جو دراصل اپنی حکومت کی بجائے اللہ کی شریعت نافذ کرنے کے لئے اس عہدے پر فائز ہوتا ہے، دیگر عہدیداروں کا تعین کرتا ہے۔ اسلامی ذخیرۂ علم سے ایسے بے شمار دلائل دیے جا سکتے ہیں جس میں مناصب پر تعیناتی کو جملہ مسلمانوں کے حق کی بجائے ان ذمہ داروں کا فرض قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جب چند لوگوں نے حضرت علیؓ کے پاس اکٹھے ہو کر ان سے خلافت قبول کرنے کی درخواست کی تو آپؓ نے فرمایا تھا کہ

"یہ معاملہ تمہارے فیصلہ کرنے کا نہیں، یہ تو اہل شوریٰ اور اہل بدر کا کام ہے۔ جس کو وہ پسند

© rasailojaraid.com

کریں گے، وہی خلیفہ ہوگا۔شوریٰ تو صرف مہاجرین وانصار(سابقین) کیلئے ہے۔اگر اُنہوں نے کسی کو امام قرار دینے پر اتفاق کرلیا تو یہ اللہ اور پوری اُمت کی رضامندی کیلئے کافی ہے۔سو ہم جمع ہوں گے اور اس معاملے پر غور کریں گے۔''(الإمامة والسیاسة لابن قتیبة :۱/۲۱)

ایسے ہی جب حضرت عمر بن عبدالعزیز کو خلیفہ نامزد کیا گیا تو اُنہوں نے وراثت میں ملی ہوئی اس امارت کو اہل حل وعقد کے سامنے پیش کردیا کہ تم جس کو چاہو خلیفہ بنا لو کیونکہ یہ تمہارا ہی حق ہے۔اُن لوگوں نے آپ کے غیر معمولی کردار اور علم کی بنا پر آپ کی ہی خلافت پر اتفاق کا اظہار کیا۔ (بحوالہ محدث: اکتوبر۱۹۹۲ء، ص۹)

ہمارے ہاں عوام الناس کے حق انتخاب کے لئے عموماً ووٹ اور بیعت کے تصور کو خوب گڈ مڈ کیا جاتا اور اس سے عوامی انتخاب پر استدلال کیا جاتا ہے۔ ایسے لوگ ووٹ اور بیعت کو مترادف باور کراتے ہیں جب کہ ان دونوں کے طریقۂ کار، مقام وحیثیت اور مقصد ومطلب سے تھوڑی سی آشنائی رکھنے والا شخص بھی دونوں کو مترادف نہیں سمجھ سکتا، مثال کے طور پر

- اسلام میں کسی عہدے کا تعین ووٹ کی بجائے اہل شوریٰ یا ذمہ دار افراد کے ذریعے ہوتا ہے جس کی تصدیق وتصویب عامۃ المسلمین بیعت کے ذریعے کرتے ہیں۔جبکہ دوسری طرف جمہوریت میں ووٹ کا بنیادی وظیفہ ہی کسی فرد کو عہدے کے لئے منتخب کرنا ہوتا ہے۔
- ووٹ کے ذریعے ایک عام شخص اپنا حق حاکمیت استعمال کرتا ہے، جب کہ بیعت کے ذریعے ایک عام مسلمان اپنے امیر کی اطاعت کا عہد کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ووٹ عہدہ کے حصول سے پہلے ہوتا ہے اور بیعت عہدہ کے حصول کے بعد ہوتی ہے۔
- پھر موجودہ پارلیمانی جمہوریت میں ووٹ بنیادی نمائندگان کے انتخاب کے لئے ہوتا ہے، جبکہ بیعت صرف اور صرف خلیفہ المسلمین کے لئے ہوتی ہے۔
- بیعت ایک مبارک شرعی تصور اور مسنون عمل ہے جس میں خلیفہ سے اطاعت کے بدلے جنت کا معاہدہ کیا جاتا ہے جبکہ ووٹ ایک خالصتاً مفاد پرستانہ دنیاوی تعلق ہے۔

اس امر سے انکار نہیں کہ اسلام اور جمہوریت میں چند ایک جزوی مماثلتیں پائی جاتی ہیں، لیکن ان مماثلتوں کا تناسب انتہائی محدود ہے۔ مثلاً دوسرے سیاسی نظاموں کی بہ نسبت دونوں میں

© rasailojaraid.com

عوام پر جبر کی بجائے ان کی فلاح اور ان کی مشاورت کو ایک خاص وقعت حاصل ہے اور دونوں میں عوام کے اعتماد کا عنصر ملحوظ رکھا جاتا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جمہوریت کی اسلام سے یہ چند مماثلتیں محض ظاہری ہیں۔ اگر باریک بینی سے عوامی نمائندگی، اعتماد اور قومی فلاح کی صورتحال کا جائزہ لیا جائے تو اسلام میں ان کی روح کارفرما نظر آتی ہے جبکہ جمہوریت میں یہ محض نعرے سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتیں۔ البتہ جہاں تک اختلافات کا تعلق ہے تو اسلام اور جمہوریت کے ہر ہر سیاسی تصور میں غیر معمولی حد تک فرق پایا جاتا ہے!

'اسلامی نظامِ سیاست' کا نفاذ کس طرح؟

اسلام کے سیاسی تصورات علم وتحقیق کا ایک طویل باب ہیں جو اپنے وسیع دائرۂ عمل کی طرح کافی گہرائی اور گیرائی کا حامل ہے۔ اس ضمن میں یہ سوال بھی بنیادی اہمیت کا حامل ہے کہ یہ نظام کس طرح مسلم ممالک میں نافذ ہوسکتا ہے، جب کہ عملاً اس وقت دنیا میں یہ نظام کہیں بھی زیر عمل نہیں ہے۔ اس سلسلے میں یہ امر تو ملحوظ رہنا چاہئے کہ اسلام کا نظامِ خلافت نہ صرف کئی صدیاں قبل انسانیت کو سکون واطمینان اور ترقی وفلاح کی ایسی منازل سے متعارف کرا چکا ہے جس کی مثالیں دنیا کے کسی دوسرے نظام نے آج تک پیش نہیں کیں۔ دوسری طرف یہ نظام کسی نہ کسی شکل میں اُمتِ مسلمہ میں ۱۳ صدیاں زیر عمل رہا ہے۔ یہ دونوں خصوصیات دنیا میں کسی دوسرے نظامِ سیاست کو حاصل نہیں ہیں۔ ان دو عملی خصوصیات کے بعد اس نظام کی افادیت اور کامیابی کے بارے میں سوال پیدا کرنا تو ایک نادانی اور حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ یوں بھی مسلمان ہونے کے ناطے اس نظامِ سیاست کے اعلیٰ واَمثل ہونے میں کوئی کلام کرنا ہمارے اعتقاد وایمان کے ہی خلاف ہے۔ اس سلسلے میں اگر کوئی کمی ہے تو وہ ہم مسلمانوں کے طرزِ عمل میں ہے۔ چونکہ یہ ایک تفصیلی عملی موضوع ہے، اسلئے فی الحال ہم اس بحث کو آئندہ شماروں تک ملتوی کرتے ہیں، موجودہ بحث صرف تصور ونظریہ تک محدود ہے۔

پس چہ باید کرد؟

قوم کو درپیش انتخاب کے اس مرحلے میں ایک مسلمان ہونے کے ناطے ہمارا رویہ کیا ہونا چاہئے۔ اس سلسلے میں پہلے تو بصیرت پر مبنی ہمارا یہ موقف واضح رہنا چاہئے کہ جمہوریت ایک غیر اسلامی نظام ہے جو ہر ہر پہلو کے اعتبار سے اپنے مخصوص نظریات کا پرتو ہے۔ اسلام اور جمہوریت میں مشترک قدریں تلاش کرنا ایسے ہی ہے جیسے کہ کسی حیوان اور انسان میں

© rasailojaraid.com

اشتراک ڈھونڈا جائے، اگر چہ ان میں بھی کئی ظاہری مماثلتیں ضرور مل جاتی ہیں جبکہ دونوں کی حقیقت اور حیثیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

اسلام کا یہ سیاسی تصور بالکل واضح ہے کہ اس میں عوام الناس اپنے نمائندے ہرگز منتخب نہیں کرتے بلکہ مناصب کا تعین ولاۃِ امر کا حق ہے۔ لیکن چونکہ موجودہ نظامِ کفر میں اس ذمہ داری کی مسلمانوں کے ذمہ داران کی بجائے عوام الناس سے توقع رکھی جاتی ہے، اس لئے عوام کم ازکم اہلیتِ شرعی کے اس وصف کو ضرور ملحوظ رکھیں جس کا تقاضا ولاۃ الامر سے شریعت مطہرہ نے کیا ہے۔ اگر وہ جمہوریت کے کفر ہونے کی بنا پر انتخاب کے عمل سے لاتعلق ہوجاتے ہیں تو اس کا نتیجہ نااہل افراد کے قوم کے سر پر مزید تسلط کی صورت میں نمودار ہوگا، جس رویہ کی مذمت اور مخالفت عالم اسلام کے کبار علما نے بھی کی ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

جمہوریت کے اُصولِ خمسہ میں حاکمیتِ عوام اور سیکولرزم کی طرح جماعت سازی کا فتنہ بھی مستقل اُصول کی شکل میں موجود ہے۔ لیکن اسلام میں جماعت بازی کے اس تصور کی بھی کوئی حمایت نہیں پائی جاتی جہاں حق کی تائید کی بجائے جماعتی موقف کی پابندی لازمی ٹھہرتی ہو۔ اسلام تو ہمیں حق بات اور عدل وانصاف کی تائید کا پابند کرتا ہے، چاہے وہ اپنے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ یوں بھی جماعتی سیاست بازی کے نتائج قوم اچھی طرح بھگت چکی ہے جہاں کئی ایل ایف او جیسے معاملوں کو جماعتی مصلحت کے تابع پورا کرنا ضروری ٹھہرتا ہے اور ذاتی مفاد کی بنا پر اللہ کے قانون کی کھلے عام توہین کے باوجود جماعتی موقف کی بنا پر دین کے نام پر منتخب ہونے والے استعفوں سے دامن کش رہتے ہیں۔ اس جماعتی سیاست بازی کا ہی نتیجہ ہے کہ بعض طالع آزما سیاستدان اپنے وفادار ساتھیوں کو تو مختلف حلقوں کے ٹکٹ سے نواز دیتے ہیں جبکہ اہل افراد ان کی چاپلوسی نہ کرنے کی وجہ سے محروم ٹھہرتے ہیں۔

ان متعدد وجوہات کی بنا پر ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے لوگوں کو ان کی انفرادی اہلیت کی بنا پر یہ امانت☆ سپرد کی جائے جو اسلام کے تصورِ اہلیت کے قریب تر ہوں، چاہے ان کا

☆ مزید تفصیل کیلئے محدث میں شائع شدہ تفصیلی فتویٰ اور مضمون بعنوان: 'پارلیمنٹ کی رکنیت اور سرکاری عہدے' (جنوری ۱۹۹۷ء ص ۴۸ تا ۹۹) اور محدث بابت ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۱ء وغیرہ

www.KitaboSunnat.com

© rasailojaraid.com

تعلق کسی بھی جماعت سے ہو۔ اگر اس بنا پر تمام اچھے اور اہل افراد اسمبلیوں میں پہنچ جاتے ہیں تو لازماً اس سے خیر کی فضا پیدا ہوگی۔ جماعتیں اَفراد سے ہی تشکیل پاتی ہیں اور اچھا فرد خوشبو کی طرح ہر جگہ کچھ نہ کچھ خیر کو پھیلانے کا سبب بن ہی جاتا ہے۔

یوں تو موقف مستقل دلائل اور بحث مباحثہ کا متقاضی ہے لیکن دورِحاضر کے تین عظیم سلفی علما کا موقف ذکر کرکے مکمل بحث جو محدث میں شائع ہوچکی ہے، کی طرف اشارہ کرنا کافی ہوگا:

◉ شیخ ابن بازؒ نے 'اسمبلی کی رکنیت اور ووٹنگ کی شرعی حیثیت' پر فتوی دیتے ہوئے فرمایا:

''فرمانِ نبوی ہے: اعمال کا دارو مدار نیتوں پر ہے، اور ہر آدمی کے لئے وہی ہے جو اس نے نیت کی۔ پارلیمنٹ میں جانے کا مقصد اگر تائیدِ حق اور انکارِ باطل ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ اس کے ذریعے داعیانِ الی اللہ کے ساتھ وابستگی اور امدادِ حق ممکن ہوسکتی ہے۔ اسی طرح ووٹنگ میں بھی کوئی حرج نہیں ہے جس سے نیک داعیوں کے انتخاب اور حق واہل حق کی تائید ہوتی ہے۔'' (معوقات تطبیق الشریعة از شیخ مناع القطان: ص ۱٦٦)

◉ شیخ محمد صالح عثیمینؒ سے بھی جب ایسا سوال پوچھا گیا تو اُنہوں نے فتویٰ دیا:

اُدخلوها أتتركونها للعلمانيين والفسقة؟ ''اسمبلیوں میں پہنچنے کی کوشش کرو، کیا تم انہیں لادین اور فاسق لوگوں کے لئے چھوڑ دینا چاہتے ہو؟''

◉ الجزائر کے 'سالویشن فرنٹ' کے سوالات کے جواب میں شیخ ناصرالدین البانیؒ کا فتویٰ یہ تھا:

''میں نہیں سمجھتا کہ مسلم عوام کو ووٹنگ سے باز رہنا چاہئے جبکہ اُمیدواروں میں اسلام دشمن بھی ہوں اور مختلف جماعتوں سے تعلق رکھنے والے دین دار بھی۔ ایسی صورتحال میں ہر مسلمان کو میری نصیحت یہ ہے کہ وہ صرف دیندار لوگوں کو منتخب کرے جو صحیح راستے کے زیادہ قریب ہوں۔'' (عربی مجلّہ الإصالة، اُردن: شمارہ۴ص ۲۰)

ان علما کرام کے فتاویٰ کی بنیاد یہ ہے کہ کم از کم دفعِ ضرر اور شر کے خاتمے کی ادنیٰ سی کوشش جاری رہنی چاہئے۔ بہر حال یہ دورِ اضطرار کے فتاویٰ ہیں، جن پر اکتفا کرلینے کی بجائے اصل نظامِ خلافت وامارت کی قیام کی کوششیں کرنا ہمارا ملی فریضہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اسلامی نظام کے نفاذ کے وعدے سے عہدہ برا ہونے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ جب تک ہم اسلام کو زندگی کے تمام پہلوؤں میں نافذ نہیں کرتے، خیر وفلاح کی اُمید اور توقع رکھنا عبث ہے! واللہ اعلم (حسن مدنی)